ذیقعدہ ۱۳۹۷ھ بمطابق نومبر ۱۹۷۷ء

معارف

جلد ۱۲۱ عدد ۵

مولانا محمد یوسف بنوریؒ

عبد السلام قدوائی ندوی

@TaleefatHakeemUlUmmatThanvi

وفیات

مولانا محمد یوسف بنوریؒ

از

عبدالسلام قدوائی ندوی

۱۹۲۷ء کا زمانہ تھا، میں اس وقت ندوہ میں پڑھتا تھا، درس کے دوران اور بحث و تحقیق کے سلسلہ میں مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ہوتا تھا، ہمارے استاد مولانا حیدر حسن خاں صاحب شاہ صاحب سے بخوبی واقف تھے، اُن کی مجلس میں شاہ صاحب مرحوم کی وسعت علم، بے نظیر حافظہ، ندرتِ فکر، اور دقتِ نظر کا ذکر آتا تھا، شاہ صاحب کے بعض شاگرد بھی کبھی کبھی آجاتے اور اپنے استاد کے علم و کمال کا والہانہ ذکر کرتے، گرمیوں کی چھٹی میں مولانا سید طلحہ پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور لکھنؤ آتے، مولانا حیدر حسن خاں صاحب مرحوم اُنکے شفیق استاد تھے، ٹونک اُن کا وطن تھا، اس طرح تلمذ کے ساتھ وطن کی مشارکت بھی اُن کو ندوہ لاتی، اور بعض اوقات کئی کئی دن مولانا حیدر حسن خاں کے ہاں ان کا قیام رہتا، مولانا طلحہ کی عقیدت اور مولانا حیدر حسن خاں کی شفقت قابلِ دید ہوتی،

مولانا سید طلحہ صاحب نے مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کو قریب سے دیکھا تھا، اور ان کے حلقۂ درس میں کئی بار بیٹھے تھے، اُن کی مخصوص صحبتوں میں بھی شریک ہوئے تھے علوم ملیّہ پر خود اُن کی اچھی نظر تھی، خصوصاً تفسیر حدیث، اور رجال کا بہت اچھا مطالعہ تھا، حافظہ بھی

غضب کا پایا تھا لیکن بایں ہمہ وہ شاہ صاحب سے بہت زیادہ متاثر تھے، اور اُن کی وسعتِ نظر، حفظ و اتقان، مہارتِ علوم، اور مجتہدانہ صلاحیت کے بیحد معترف تھے، اُن کا تذکرہ بڑے کیف و وجد کے ساتھ کرتے، کہا کرتے تھے، کہ اگر میں نے مولانا انور شاہ صاحب کو نہ دیکھا ہوتا، اور اُن کے حافظے کا ذاتی تجربہ نہ ہوتا، تو مجھے ان روایتوں کو تسلیم کرنے میں تامل ہوتا جو کتابوں میں سلف کے حافظے کے بارے میں درج ہیں، لیکن شاہ صاحب کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ جس امت کے پچھلوں کا یہ حال ہے، اس کے اگلوں کی کیا کیفیت ہوگی،

یہ باتیں سُن کر مجھے اور میرے ساتھیوں کو بھی شاہ صاحب علیہ الرحمہ سے بڑی عقیدت پیدا ہو گئی، دیکھنے کا اتفاق تو اس کے کئی برس بعد ہوا لیکن دل پر اُن کی عظمت کا نقش اسی وقت سے قائم ہو گیا تھا، شاہ صاحب کے شاگردوں کے نام بھی کبھی کبھی کان میں پڑتے تھے، مولانا حفظ الرحمٰن، مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا احمد رضا کے نام بار بار سننے میں آئے، پھر جب مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مرحوم کے زمانۂ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند میں عظیم الشان اسٹرائک ہوئی، اور مولینا انور شاہ صاحب، مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ متعدد بزرگوں نے استعفا دیکر دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کی، تو عرصہ تک اخبارات میں ان واقعات کا چرچا رہا، بعض اخبارات تو محض انھیں مسائل پر بحث کے لئے نکالے گئے تھے، یہ اسٹرائک بڑی خطرناک تھی، اور ڈر تھا کہ کہیں بزرگوں کی نصف صدی کی کمائی خاک میں نہ مل جائے، لیکن اللہ نے اس کے نقصان سے بڑی حد تک محفوظ رکھا، ایک طرف مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث کے منصب کو سنبھال لیا، اور دوسری طرف بعض اہلِ خیر نے ڈابھیل (گجرات) میں شاہ صاحب اُن کے رفقاء اور شاگردوں کو بلاکر

ایک نئے علمی مرکز کی بنیا د رکھدی، اساتذہ کی علمی شہرت، کارکنوں کی دل سوزی، اور معاونین کی دریا دلی نے سارے ملک میں اس درسگاہ کا ایسا سکہ جما دیا، کہ تشنگان علم دور دور سے کھنچ کر اس چشمۂ صافی کے گرد جمع ہوگئے، اور ڈابھیل کے گلی کوچوں میں قال اللہ اور قال الرسول کے ترانے گونجنے لگے، شاہ صاحب کی صحت پہلے ہی اچھی نہ تھی، ڈابھیل کی مرطوب آب و ہوا اور مضر ثابت ہوئی، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کام میں لگے رہے اور جب تک صحت کی خرابی نے بالکل مجبور نہیں کر دیا، وہ یہاں سے نہیں ٹلے، ان کا قیام اگرچہ زیادہ عرصہ نہیں رہ سکا، مگر اس کے باوجود ڈابھیل دیوبند کا ثانی سمجھا جانے لگا، شاہ صاحب کے بعد ان کے مشن کو ان کے شاگردوں نے نہ صرف جاری رکھا، بلکہ اس میں چار چاند لگا دیئے، ان اصحاب میں مولانا محمد یوسف بنوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں، انھوں نے درس و تدریس کے علاوہ ڈابھیل میں نشر و اشاعت کی غرض سے ایک علمی مجلس بھی قائم کی، جس کی طرف سے بہت سی بیش قیمت کتابیں شائع ہوئیں، شاہ صاحب کی سوانح عمری کے علاوہ ان کے افاداتِ درس بھی کئی ضخیم جلدوں میں مرتب کر کے شائع کئے گئے، ان میں بخاری کی شرح فیض الباری خاص طور سے قابلِ ذکر ہے، قدما کی کتابوں میں ہدایہ کی تخریج نصب الرایہ کی بڑی اہمیت ہے، لیکن پہلے یہ بہت ہی معمولی کاغذ پر چھپی تھی، اور اس کے نسخے بھی بہت کمیاب تھے، مولانا بنوری کا حدیث و فقہ کے طلبہ پر بڑا احسان ذکر انھوں نے مصری ٹائپ میں بہت اچھے کاغذ پر اس کتاب کی طباعت کا انتظام کیا، اور اس کے ساتھ بڑے عالمانہ حواشی تحریر کئے، جن کی وجہ سے اس کتاب کا افادہ بہت بڑھ گیا حضرت شاہ ولی اللہ کی بعض نایاب کتابیں بھی اُن کی توجہ سے شائع ہوئیں، ملک کی تقسیم کے بعد انھیں بھی پاکستان جانا پڑا، لیکن ان کی علمی اور تعلیمی سرگرمیاں

وہاں بھی جاری رہیں، بلکہ ہندوستان سے بھی زیادہ وہاں انھوں نے علم ودین کی خدمت کی، کراچی میں ایک درس گاہ کی بنیاد ڈالی جس نے ان کی زندگی ہی میں بڑی مرکزیت حاصل کرلی، اس درسگاہ کے ساتھ ایک ماہنامہ بینات" بھی جاری کیا، جو اپنے وقیع علمی ودینی مضامین کی وجہ سے بہت ممتاز ہے، ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی عربی مدارس کے درمیان کوئی رشتہ، ارتباط نہیں تھا، وہاں کے سرکاری حلقوں نے اس انتشار سے فائدہ اٹھانا چاہا، اور ان مدارس کو سرکاری سرپرستی میں لے کر مشرقی امتحانات کا مرکز بنا دینے کی کوشش کی، لیکن مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم نے بڑی ہمت سے اس صورت حال کا مقابلہ کیا، اور آزاد عربی مدارس کا ایک وفاق بنا دیا، جو بہت مفید ثابت ہوا، جو حضرات عربی مدارس سے تعلق رکھتے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ کام کتنا مشکل تھا، اس کامیابی سے ایک طرف اُن کے اثر ورسوخ کا اندازہ ہوتا ہے، اور دوسری طرف یہ پتہ چلتا ہے کہ انھیں دینی اور علمی حلقوں میں کتنا اعتماد حاصل تھا، ان اہم کاموں کے علاوہ انھوں نے وہاں لامذہبیت اور بدعقیدگی کو بھی روکنے کی کامیاب کوشش کی، اس سلسلہ میں بعض اوقات انھیں حکومت سے بھی ٹکر لینی پڑی، لیکن انھوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی، اُن کی اس ہمت اور استقامت کو دیکھ کر بعض دوستوں نے بے ساختہ کہا کہ یہ کسی بنوری ہی کا دل وگردہ تھا، ورنہ جنرل یوبجے فوجی اقتدار کے زمانہ میں ایسی جرأت کی توقع کسی سے مشکل ہی سے کی جاسکتی تھی، وہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے نامور خلیفہ شیخ آدم بنوری کی اولاد میں تھے، اور اُن کے اندر دینی حمیت، تجدیدی روح اور استقامت و ثبات قدمی انھیں کی وراثت کی بنا پر آئی تھی، جو شاہجہاں کے شان و شکوہ اور اسکے صاحب اثر وزیر سعداللہ خاں کے جاہ و جلال کو خاطر میں نہیں لایا، اس کا نام لیوا ایوبی حکومت کی کیا

پرواہ کرتا، اُن کی ہمت و استقامت نے بہت سے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو سہارا دیا، الحاد و بے دینی کے اڈے ٹوٹ گئے، اور ملحدین کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی، مسلم ممالک میں بھی ان کا بڑا اثر تھا، اور اکثر اسلامی اور دینی کانفرنسوں میں انھیں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی، اور اُن کے علم و تجربہ سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا، میرا ان سے ملنا جلنا زیادہ نہیں ہوتا تھا، مگر جب مل جاتے تو بڑی محبت سے پیش آتے ۱۹۷۶ء کے موسم حج میں اُن کے والد صاحب بھی ساتھ تھے، مجھے اُن سے خاص اہتمام سے ملایا، اور میرا تعارف بڑی تعریف و توصیف کے ساتھ اُن سے کرایا، جب بھی ملاقات ہوتی، بڑی خوش دلی اور بشاشت کے ساتھ ملتے، آخری بار ۱۹۷۷ء میں مکہ معظمہ میں ملاقات ہوئی، اس وقت کمزور بہت تھے، پیدل چلنا دشوار تھا، اس لئے سعی گاڑی پر کر رہے تھے، آخری ملاقات وہیں مسعیٰ میں ہوئی، پھر اس کے بعد ملنے کا موقع نہیں ملا، کئی مہینہ سے اُن کی بیماری، اور کمزوری کی خبریں آرہی تھیں، بالآخر وقت موعود آپہنچا، اور ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو جان جان آفریں کے سپرد کردی، اللہ انھیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے، اُن کے مراتب بلند فرمائے، اور اُن کے جانشینوں کو اُن کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے

انھوں نے علم دین کی خدمت کے لئے جو ادارے قائم کئے تھے، امید ہے کہ وہ برابر ترقی کرتے رہیں گے، اور اُن کے دائرہ کار میں مزید توسیع ہوتی رہے گی، تصانیف کے جو مسودے مکمل ہو چکے ہیں، اُن کی طباعت کا انتظام جلد ہونا چاہئے، اور جو ابھی نامکمل ہیں، اُن کی تکمیل کا بندوبست کرنا چاہئے، اس بارہ میں جامع ترمذی کی شرح خاص طور سے قابل ذکر ہے، امید ہے کہ اُن کے لائق جانشین اس کی تکمیل اور اشاعت کی خاص فکر کریں گے،